مولانا عبد القیوم حقانی

علماء کرام زمام قیادت اپنے ہاتھ میں رکھیں

یورپ و امریکہ کو اسلامی قیادت سے چڑ کیوں؟

موجودہ اور مروجہ سیاست کی ابتری اور بے دینی کے غلبہ کے بعد گزشتہ کئی سالوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ بعض مشائخ عظام اور کچھ علماء کرام حکام کے جلو میں فروکش نظر آتے ہیں تو ہم نے اس پر بارہا "مرثیہ" لکھا کہ زمانہ یوں بھی اپنے انداز بدلتا ہے کہ جن کے بڑوں کی کٹیا میں بڑے بڑے شاہان کرو فر اپنی کلاہ اتار کر دو زانو بیٹھنے میں سعادت دارین سمجھتے تھے آج ان کے وارث دیہاور ایک نسبتاً چھوٹے حکمران کے ساتھ ملاقات کو باعث عزت و شرف سمجھ رہے ہیں، جن علماء اور مشائخ کو پوری قوم کی رہنمائی کرنی تھی وہ آج کسی کرسی نشین سے اپنا لائحہ عمل پوچھ رہے ہیں یہ زخم ابھی تازہ تھا اور امید تھی کہ پھاہا رکھنے سے مندمل ہو جائے گا مگر اس پہ ایک اور چرکا لگ گیا اور وہ یوں کہ انہی حکمرانوں نے باضابطہ طور پر مشائخ اور علماء کرام کو یاد فرمایا اور کنونشن کر ڈالا ایک سیٹ بنالی ہے علماء کرام کی ایک بڑی تعداد نے آن بان و ہوں پر لبیک کہا اور کشاں کشاں چلے آئے اور اب تو قرب سلطان میں مسابقت کا جذبہ اور بھی بڑھتا چلا جا رہا ہے تو اس سے پرانا زخم پھر کھل گیا کے مصداق آج نوک قلم پر خون کے قطرے آگئے ہیں جو آنکھوں سے نکلے اور صفحۂ قرطاس پر ثبت ہو رہے ہیں۔

اور اب سوچنا اور کڑھنا یہ ہے کہ ایسا زور دار قلم کہاں سے لایا جائے جو علماء کی داستان عزیمت و فضیلت ایسے انداز میں لکھے کہ علماء کو یقین آجائے کہ واقعی وہ خاکبازی سے لیے نہیں بلکہ اندیشۂ افلاکی کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور انہیں اس منصب کا خیال رکھنا چاہیے، ایسے الفاظ کہاں سے لائے جائیں جن کا ایک ایک شوشہ علماء کے مقام اور اعزاز کا ترجمان بن سکے اور علماء جان جائیں کہ ان کے دامان قبا میں پیوند تو ہر دور میں نظر آئے لیکن دھبہ کبھی دکھائی نہیں دیا، اس ماحول میں ہم ایسے گمنام اور خوابوں کی دنیا کے لوگ تو یہی بات ہے۔ ع

ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے

پھر اخبارات میں علماء کنونشن کی تصویریں چھپتی ہیں اور جھلکیوں میں حکمرانوں کی جھڑکیاں بھی پڑھتے ہیں گزشتہ دور کے ایک حکمران کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا تھا کہ "محفل کو سنجیدہ رہنے دیں بلا وجہ روک ٹوک کی ضرورت نہیں" تو بے اختیار ذہن کے البم میں علامہ ابن تیمیہؒ کی تصویر ابھر آئی جنہوں نے اپنے دور کے باجبروت منگول حکمران کو انہی کے دربار میں مخاطب ہو کر کہا تھا۔

"تمہاری سلطنت کی حیثیت اور خود تمہاری ذات میری جیب میں پڑے ہوئے چھوٹے سے سکے کے برابر بھی نہیں۔"

میں نے کئی بار اس بات پر غور کیا کہ کیا اس زمانے کے حکمران کسی نرم چمڑے اور ابن تیمیہؒ جیسے لوگ فولاد کے بنے ہوئے تھے؟ نہیں بلکہ دونوں ہی گوشت پوست کے تھے فرق صرف یہ تھا کہ علماء کرام کو اپنے منصب اور نسبت کا جیتا جاگتا اور توانا احساس تھا اور انہیں بخوبی ادراک تھا کہ حکمرانوں کے یہ تخت پائے چوبیں رکھتے ہیں اور پائے چوبیں سخت بے تمکیں ہوتا ہے، جب کہ علماء کی مسند دراصل رسولِ خدا ﷺ کی مسند ہے جسے نہ وقت کی کروٹیں کمزور کر سکتی ہیں اور نہ زمانے کی آندھیاں اپنی جگہ سے ہٹا سکتی ہیں یہ حکمران زور جاگیر کے بل بوتے پر قائم ہیں اور زور جاگیر اصل نہیں فقط سایہ ہیں جو کسی وقت ڈھل سکتا ہے جب کہ علماء کی طاقت و عزت علم اور عرفان ہے جسے نہ آگ جلا سکتی ہے نہ زمین کھا سکتی ہے اور نہ چور اُڑا لے جا سکتے ہیں اسی باعث حقیقی علماء اپنے کردار کی صلاحیت اور گفتار کی صحت سے کھدّر پہن کر بھی اطلس و کمخواب پوشوں کو محو حیرت کر دیتے تھے، سوکھے ٹکڑے کھا کر گھر سے نکلتے اور مرغ و ماہی کی قابوں سے سجے دسترخوانوں کو اپنے خندۂ استہزاء سے پھیکا بنا دیتے، مٹی کا پیالہ ہاتھ میں لے کر مینا و ساغر کی محفل کا رنگ بدل آتے، دو پیسے کی ٹوپی سر پر رکھ کر جاتے اور تاج و کلاہ کو تار تار کر آتے، دانائے راز اقبال نے شاید اسی تاثر کو اپنے الفاظ دیئے ہیں۔

نہ تاج و تخت میں ہے نہ لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

مشائخ اور علماء کسی حکمران کے بلاوے پر کیوں ایوانِ صدر اور چیف منسٹر ہاؤس کا رُخ کرتے ہیں؟ مانا کہ صدر کا گھر مرمر کی سلوں سے آراستہ ہے مگر پھر بھی خانۂ خدا کی کچی اور ٹیڑھی اینٹوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا، جس کے علماء وارث ہیں، تسلیم کہ چیف منسٹر ہاؤس فانوسوں سے پیراستہ ہے مگر مسجد میں رکھے ہوئے مٹی کے دیے سے زیادہ مقدس نہیں، بلاشبہ ایوانِ صدارت و وزارت میں بیش قیمت قالین بچھے ہیں مگر عبادت گاہ کی چٹائی کا ایک تنکا ان سے زیادہ احترام کے لائق ہے، میں مانتا ہوں کہ صدر کا ایوانِ صدر، وزیر اعظم کا سکیرٹریٹ گورنر کا گورنر ہاؤس اور وزیر اعلیٰ کا بنگلہ اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتا ہے لیکن کیا مسجد کی روحانیت سے زیادہ؟ وہ اپنے اندر بڑی کرّوفر رکھتے ہیں مگر کیا مسجد کے بام و در سے زیادہ جہاں صدر کو بھی اپنے جوتے اتارنے پڑ جاتے ہیں، سنگِ مرمر کی راہداریوں کو جوتے کے تلووں سے لتاڑا جا سکتا ہے لیکن مسجد کے کچے صحن پہ وزیر اعلیٰ کو بھی اپنی پیشانی رگڑنی پڑتی ہے، مقامِ غور و فکر ہے کہ کس کا گھر اچھا اور کس کی نسبت بڑی؟ قابلِ احترام علماء کرام! شیشۂ گرانِ غیر سے اپنا جام سفال ہر حال میں بہتر ہوتا ہے، اقبال مرحوم نے ایک جگہ

جگنو اور پروانے کا مکالمہ نقل کیا ہے پروانہ جگنو سے کہتا ہے ؎

پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو
کیوں آتشِ بے سوز پہ مغرور ہے جگنو

جگنو جواب میں کہتا ہے ؎

اللہ کا صد شکر کہ پروانہ نہیں ہیں
دریوزہ گرِ غیر کا دیوانہ نہیں ہیں

دریوزہ گر کے کشکول میں پڑے ہوئے ہیروں اور موتیوں سے اپنے شکستہ دامن میں موجود بھُنے ہوئے چنے زیادہ لطف دیتے ہیں۔ علماء کی سرکاری درباروں میں حاضریوں، کنونشنوں میں خود نمائیوں اور سرکاری اخراجات پر حجوں اور غیر ملکی تقریبات میں شرکتوں کے بارے میں پڑھ پڑھ کر یہ خیال آیا کہ کیوں نہ علماء کرام سے یہ گزارش کی جائے کہ جہاں اپنا محدود علم و مطالعہ اور تاریخی حقائق ساتھ دیتے ہیں وہ یہ کہ ہر ملی اور سیاسی تحریک کا نقطۂ آغاز آپ کی ذاتِ گرامی بنی ہے بارش کا پہلا قطرہ بننے کا اعزاز آپ کو حاصل ہے مگر جب چھما چھم برسنے کا وقت اور سرزمینِ ملت میں روئیدگی کا موقع آیا تو بوجوہ کچھ اور لوگ گہرے بادل بن کر اٹھے اور مطلع سیاست و ملت پر چھا گئے، جس کے نتیجے میں سارا کریڈٹ انہیں مل گیا ماضی قریب کی تاریخ ہی سامنے رکھ لیں تو مسئلہ واضح ہو جاتا ہے سنوسی تحریک، امام شامل کا نعرۂ حق، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، نورسی موومنٹ، تحریکِ خلافت، تحریکِ ہجرت، بالاکوٹ کا مقتل، تحریکِ ریشمی رومال، جزائر انڈمان کی داستانِ عزم و ہمت، قیامِ پاکستان، تحریکِ نظامِ مصطفیٰ ہر جگہ مؤثر ترین عنصر اور محرک دین و مذہب رہا اور پیش پیش علماء ذی وقار، ہر تعذیب و تعزیر ہنسی خوشی اس لیے برداشت کی گئی کہ جذبۂ محرکہ دین تھا اور آنکھوں کے سامنے علماء کی صفیں، ع

چون پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

الجزائر میں قبرستان آباد ہو گئے، سوڈان اور لیبیا کے صحرا لالہ زار بن گئے، مصر و شام کے گلی کوچے داستانِ شوق و عشق کے ورق ہو گئے، افغانستان کی نہیں ہند بساطِ عزم و مستی فراسائی محض اس لیے کہ دل و دماغ کی پیشانیاں سجدہ گاہِ دین پر جھک گئیں، الغرض ہر تحریک کا مواد اور محرک دین تھا اور قیادت رجالِ دین کی تھی، مگر جب پھل پک کر گرنے کا وقت آیا تو جھولیاں انہوں نے آگے کر دیں جو یا تو نکتہ چین تھے یا پھر تماشا بین، اور پھر وہی لوگ ہیرو بن گئے اور رفتہ رفتہ علماء کرام کو اس دھارے سے الگ کرنے کا معمول بن گیا اور غالباً علماء بھی اس پر قانع اور مطمئن ہو گئے۔ حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ علماء نے نہ کبھی "سر" کا خطاب حاصل کیا اور نہ "آنریبل" کہلانے کے شوق کے اسیر بنے، نہ انہیں "خان بہادر" کا لقب ملا، اور نہ ہی "نہ ہزاری اور دہ ہزاری" کے منصب پہ فائز

ہوئے، اور اسی طرح آج تک علماء نے نہ کوئی ملک توڑا، نہ ملک بیچا اور نہ مارشل لاء لگانے کے گنہ گار ٹھہرے، ان اعزازات کی مالا ان کے گلے میں نظر آتی ہے جو آج سوختہ نصیبی سے عہدۂ قیادت پر جلوہ گر نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود بعض علماء کرام دانستہ یا نادانستہ دنیا پرست اور سیکولر قیادت کا ضمیمہ بننے پر رضامند ہو گئے، کتنے اونچے اور باوقار نام ہیں جو ان سیاسی لوٹوں کے حوالوں کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں، جو کل تک انگریز کے تسمے باندھنے اور کھولنے میں سبقت لے جانے کا مظاہرہ کرتے تھے آج علماء کی انگلیاں پکڑ کر انہیں آداب سیاست و حریت سکھا رہے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

مدعا یہ ہے کہ آپ حضرات ہر معاملے میں زمام قیادت اپنے ہاتھ میں رکھیں، ضمنی کے بجائے قائدانہ کردار ادا کریں، کوئی حکمران، کوئی جاگیردار، کوئی سرمایہ دار کوئی عہدیدار اور کوئی ابن الوقت سیاستدان آپ کو اپنی مرضی کے ایشو پر اپنا ہمنوا نہ بنا سکے۔ سلف صالحین کے سیاسی آباد سے ہزار اختلاف سہی لیکن ان علماء کے طرز عمل کو ضرور ملحوظ رکھا جائے انہوں نے قربانیاں خود دی ہیں اور منصب قیادت بھی اپنے ہاتھ میں رکھا، وہ کسی آکسفورڈ اور کیلیفورنیا کے پڑھے ہوئے شخص کا ضمیمہ بننے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

آج کل یورپ اور امریکہ جو "بنیاد پرستی" کا دھنڈھورا پیٹ رہا ہے صرف اس لیے کہ اُسے اس لفظ میں علماء کے وقار کی بحالی نظر آرہی ہے وہ "مرغانِ دست آموز" سیاستدانوں کو برداشت کرتا ہے متقی اور مجاہد علماء کی قیادت اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی، یورپ اور امریکہ کو اسلام سے بھی زیادہ "اسلامی قیادت" سے چڑ اور بُغض ہے، اُسے اُس اسلام سے ڈر ہے جسے روحِ اسلام سے ہم آہنگ علماء پیش کر رہے ہیں، کیوں کہ خدا ترس اور سر شناسِ دین علماء کے ہاتھوں برپا ہونے والا انقلاب یورپ اور امریکہ کے تاج قیادت کا سارا وقار خاک میں ملا دے گا۔

اگر علماء معمولی سطح کے حکمرانوں کی باہنوں میں باہنیں ڈالنے کو بیقرار ہوں اور ان سے ملاقات کو "ملاقاتِ مسیحا و خضر" کا درجہ دیتے ہوں تو امام احمد بن حنبلؒ اور مجدد الف ثانیؒ کی میراث کون سنبھالے گا؟ اگر ان بزرگوں کے نام لیوا ہی ان کے ورثۂ علم وجہاد کو طاقِ نسیاں کی نذر کر دیں یا اپنے لیے لائقِ فخر سمجھنا چھوڑ دیں تو آخر کون ہوگا جو ان ٹمٹماتے چراغوں کو اپنے ہاتھ کا دامن بنا کر بجھنے سے بچائے گا؟

ے
خضر کیوں کر بتائے، کیا بتائے ؟
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے ؟